اُمت یا ریاست؟

ڈاکٹر ساجد خاکوانی
کالم نگار، اسلام آباد

چندروز قبل ایک مذاکرہ میں ملک کے ممتاز دانشور شریک تھے۔ مذاکرے میں سامعین کی طرف سے ایک سوال کیا گیا کہ اگر ریاست اور اُمت کے مفادات ٹکرا جائیں تو فوقیت کس کو حاصل ہوگی؟

ایک معروف دانشور نے جواب دیا کہ اُمت کے مفادات بہرحال مقدم ومحترم رہیں گے اور انہوں نے اپنے موقف کے حق میں دلائل بھی دیئے۔

بعض دیگر دانشوروں نے ان سے اختلاف کیا، ایک صاحب نے فرمایا کہ: خلافتِ راشدہ کے بعد سے اُمت کا وجود ختم ہو چکا ہے۔ ایک اور فاضل مفکر نے اُمت کو محض لسانی بنیادوں پر عربوں کی میراث کہا اور غیرعرب مسلمانوں کے اُمت ہونے کو جذباتیت قرار دیا۔ ایک بزرگ دانشور نے کہا: گزشتہ ڈیڑھ ہزار سالوں میں ملوکیت کے باعث اُمت کا وجود کہیں نظر ہی نہیں آتا۔ اور ایک صاحب نے حالاتِ حاضرہ کے حوالے سے فرمایا کہ: صرف ہندوستانی اور پاکستانی مسلمان ہی اپنے آپ کو اُمت کا حصہ سمجھتے ہیں، باقی پوری دنیا کے کلمہ گو صرف اپنی قوم پرستی میں مبتلا ہیں۔ ان سب حضرات نے اپنے اپنے موقف کے حق میں بہت دلائل بھی دیئے اور نتیجہ نکالا کہ اگر ریاست اور اُمت کے مفادات کا ٹکراؤ ہو جائے تو اُمت کو پس پشت ڈال کر اپنی قوم، اپنا ملک، اپنی نسل اور اپنی ذریت کے مفادات کا ہر قیمت پر تحفظ کیا جائے۔

ہمیں ان کی نیت پر قطعاً بھی شبہ نہیں، ان کی شخصیتیں قابلِ احترام اور ان کے دلائل قابلِ غور و فکر ہیں، لیکن ہم ان کے موقف سے علمی وتجزیاتی اختلاف کرتے ہوئے اس بات کے حق میں دلائل دینا چاہتے ہیں کہ اُمت کسی حادثے کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی اور نہ ہی کسی سانحے کے بعد ختم ہو چکی ہے۔ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوتِ مقدسہ سے اس کی تاسیس ہوئی، صحابہؓ واہلِ بیت مطہرینؓ نے اپنے خون سے اس کی آبیاری کی، ائمہ اُمت نے اپنی مجتہدانہ کاوشوں سے اس کو جلا بخشی، محدثین نے روایت و درایت کے اصولوں سے اُمت کا علمی وتحقیقی قد اس قدر بلند کر دیا کہ دوسری قومیں اپنے بلند و بالا پہاڑوں پر چڑھ کر

بھی اس کے عروج کو نہیں پہنچ سکتیں اور مجددینِ اُمت نے وقتاً فوقتاً کبھی اس کی بنیادوں کو مضبوط تر کیا تو کبھی اس کی بلندی وپختگی میں مزید اضافہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ فرڈیننڈ کی توپوں سے مغرب کے میزائلوں تک اور یہود کی سازشوں سے ہنود کی مکاریوں تک کوئی بھی اس کے وجود کو عنقا نہ کرسکا اور آج غلامی کے اندھیر غار سے نکل کر یہ اُمت ایک بار پھر اپنے شاندار ماضی کو مستقبل کے آئینہ میں تلاش کیا چاہتی ہے۔

اُمت یا ریاست؟ یہ سوال اسلامی نظریۂ حیات کے اس باب سے تعلق رکھتا ہے جس کے ڈانڈے اسلام کے سیاسی نظام سے ملتے ہیں۔ سیاسی نظام کا سہرا حکمران کے سر پر ہوتا ہے اور قبیلۂ بنی نوع انسان نے ماضی سے تاحال حکمرانوں کے چناؤ سے مشکل کام نہیں دیکھا۔ کشتوں کے پشتے اور خون کی ندیاں وہ بھاری قیمت ہے جو حکمرانوں کی تبدیلی کا نتیجہ بنتی ہے یا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ مسلمانوں نے بعد از نبوت ہی اس بالغ نظری کا ثبوت دیا جو اسی اُمت کے شایانِ شان ہے کہ صرف مشاورت کے نتیجے میں ہی خلافتِ راشدہ کے حکمران اُمتِ مسلمہ کے اجتماعی معاملات کے نگران مقرر ہوئے۔ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انتخاب خواص کی محفل میں ہوا اور عوام نے اس کی تائید کی۔ خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی نامزدگی شورائیت کے ذریعے عمل میں آئی۔ خلیفۂ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور خلیفۂ چہارم حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کے لیے ایک کمیٹی کو مینڈیٹ سونپا گیا، جس نے دونوں کو ترجیحاً اولیت اور ثانویت دی، جس کے مطابق اقتدار کی باگ ڈور اُن کے سپرد کی گئی۔ پہلے دو خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے وقت تو صرف عرب علاقے ہی زیرِ اسلام تھے، اگر اُمت کا وجود نسل یا زبان کا مرہونِ منت ہوتا تو عجم کی فتوحات غلامی کے خاتمے کا مقدمہ کبھی نہ بن پاتیں اور خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ حکمرانی میں ہی غیر اقوام کے گلے میں عربوں کی غلامی کا طوق ڈال دیا جاتا، لیکن یہ اُمت صرف ایک کلمہ کے باعث ہی اپنا وجود رکھتی ہے، چنانچہ تاریخ نے جہاں اس زمانے کا ایک ایک لمحہ اپنے سینے میں محفوظ کیا ہے، وہاں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ اُمت کے کسی حصہ سے عرب قومیت کے خلاف یا اپنی مقامی قومیت کے حق میں آواز اُٹھی ہو اور مہینوں کی مسافت کے علاقے بھی مرکز سے دور ہونے کے باوجود کبھی اپنے بارے میں اس احساسِ کمتری کا شکار نہ رہے کہ عربوں کو ہمارے اوپر حقِ حکمرانی حاصل ہے یا وہ ہمارے وسائل سمیٹ کر تو ہمارا استحصال کررہے ہیں۔

ممکن ہے ان حقائق کو جذباتیت سمجھ لیا جائے، جیسا کہ ایک فاضل دانشور نے اپنی گفتگو میں اس کا تذکرہ بھی کیا، لیکن کیا یہ تاریخی حقیقت نہیں کہ فاتح اقوام جہاں بھی گئیں انہوں نے غلاموں پر اپنی ثقافت اور تہذیب کے جھنڈے اس مضبوطی سے گاڑے کہ صدیوں تک اس کے اثرات باقی رہے؟! اور کیا یہ حقیقت نہیں کہ غلاموں نے اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے کس کس طرح کی غداریاں کیں اور اپنی ہی

قوم کا سر نیچا کر کے آقاؤں کی آشیر باد حاصل کی؟! برِصغیر پاک و ہند اس کی زندہ مثال ہے کہ اکیسویں صدی کی دہلیز پر چکا چوند روشنیوں اور ''روشن خیالی'' کے باوجود غلامی کی زنجیریں آج بھی پوری شد و مد سے باقی ہیں، لیکن یہ مسلمانوں کے لیے اُمت ہونے کا ثبوت ہے۔ ایک ہزار سال کے دورانیے میں مشرق سے مغرب تک حکومت کرنے والے مختلف النسل، مختلف اللسان اور حتیٰ کہ مختلف الخیال مسلمان حکمرانوں نے کسی قوم کو خواہ وہ غیر مذہب سے بھی تعلق رکھتی تھی، اپنا تہذیبی و ثقافتی و معاشی غلام نہیں بنایا۔ کتاب اللہ تعالیٰ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمت کے ہر علاقے میں پہنچے، لیکن عربی تہذیب و تمدن عرب سے باہر نہ نکل سکا۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد ہر مسلمان کی فرائض کی فہرست میں شامل ہیں، لیکن عربی زبان کو کسی مسلمان نے اپنے آقاؤں کی زبان سمجھ کر قبول نہیں کیا اور فقہی مذاہب عرب کے علاقوں سے ہی نکل کر پوری اُمت میں پھیلے اور آج تک موجود ہیں، لیکن کوئی مسلمان ان مسالک کی پیروی کرتا ہوا اپنے آپ کو عربوں کا ذہنی غلام تصور نہیں کرتا۔ عربی جبہ، عربی کھانے، عرب شعائر اور عرب رسوم و رواج کو کبھی کسی مسلمان معاشرے نے جاری نہیں کیا۔ یہ اظہر من الشّمس ثبوت ہیں کہ مسلمان ایک قوم نہیں، بلکہ ایک اُمت ہیں اور اس اُمت میں کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں، سوائے تقویٰ کے۔

مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ اقتدار میں اس بات کے بے شمار ثبوت ہیں کہ کل مسلمان ایک سیاسی وحدت میں پروئے ہوئے تھے اور اُمت کا تصور ہر حال میں موجود تھا۔ جنگِ صفین کے موقع پر رومی حکمران نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو مدد کی پیشکش کی، حضرت نے اسے واضح طور پر باور کرادیا کہ یہ ان کا داخلی معاملہ ہے اور اس معاملے میں کوئی خارجی مداخلت قبول نہ کی جائے گی۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا جواب اس قدر شدید تھا کہ اس حکمران کو پھر کبھی ایسی بات کی جرأت نہ ہوئی۔ عباسیوں کے دورِ خلافت میں پوری اسلامی دنیا میں جہاں کوئی حکمران تخت پر بیٹھتا تھا، اس وقت تک اس کی تاج پوشی نہ کی جاتی تھی جب تک مرکزِ خلافت میں امیر المؤمنین اس کی سندِ اجازت پر اپنے دستخط نہ ثبت کردیتا، حتیٰ کہ اندلس میں جہاں عباسیوں کے جانی دشمن اُموی حکمران اقتدار میں تھے، وہ بھی ایک طویل عرصے تک مرکزِ خلافت کی سیاسی قیادت کے عنوان کے باعث صرف امیر کا لقب ہی اختیار کیے رہے۔ ریاست اگر اُمت سے برتر ہوتی تو صلیبی جنگوں میں پوری اسلامی دنیا کی نمائندگی کبھی نہ ہوتی اور ہر ریاست یہ سوچتی کہ قبلہ اول جاتا ہے تو جائے، بس ہماری مملکت ہی محفوظ رہے۔ اور اگر ریاست کے مفادات اُمت سے بالاتر ہوتے تو افریقہ کے مسلمان اُندلسی مسلمانوں کی مدد کو کبھی نہ آتے اور اگر ریاست اور اُمت کے ٹکراؤ میں ریاست اول نمبر پر گردانی جاتی تو مصر سے مسلمان نکل کر صحرائے گوبی سے اُمڈتے ہوئے طوفان کو روکنے کے لیے عراق و شام کا سفرِ صعوبت طے نہ کرتے۔ بھلا سمرقند و بخارا، ترمذ، نساء اور خراسان کا حجاز سے کونسا نسبی، نسلی،

علاقائی، لسانی یا سیاسی تعلق ہے کہ آج تک ان علاقوں سے نکلنے والے علماء کی کتب حجازیوں سمیت پوری عرب دنیا کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ کیا کبھی عرب علماء اسلام نے صحیح بخاری یا صحیح مسلم یا سنن نسائی یا جامع ترمذی کو اس نظر سے دیکھا ہے کہ یہ عجمیوں کی کتب ہیں؟! اور اس لیے درجہ دوم میں شمار کیا جائے؟! امام ابوحنیفہؒ سمیت فقہاء کی ایک لمبی فہرست ہے جو عجم کے علاقوں سے تعلق رکھتے تھے، لیکن انہیں عرب سمیت پورے عالم اسلام میں جو پزیرائی حاصل ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ یہ وہ اَن مٹ ثبوت ہیں جو یہ باور کراتے ہیں کہ مسلمانوں کا خمیر ایک کلمہ کی بنیاد پر قائم ہے اور یہی خمیر اُمت کا سرمایہ ہے، جس کا ایک ایک فرد ایک جسم کی مانند ہے کہ اگر ایک عضو بیمار ہو تو سارا جسم بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جائے۔

مسلمان کسی علاقے کے رہنے والے ہوں، کوئی زبان بولنے والے ہوں، کسی نسل سے تعلق رکھتے ہوں، کوئی سا رنگ ان کے جسموں پر نظر آئے، غریب ہوں، امیر ہوں، پڑھے لکھے ہوں، جاہل اَن پڑھ ہوں، کسی تہذیب وتمدن کے حامل ہوں، ان کی بستیوں میں ایک ہی اذان گونجے گی، ان کی مساجد کا رخ ایک ہی قبلے کی طرف ہوگا، ان کی نمازیں ایک ہی زبان میں ادا کی جائیں گی، ان کا قرآن ایک ہی ترتیب کا حامل ہوگا، ان کی عقیدتوں، محبتوں، اطاعتوں، فرمانبرداریوں اور وفاداریوں کا مرکز ومحور ایک ہی ذات بابرکات ﷺ ہوگی اور وہ ایک ہی معبود کے عبادت گزار ہوں گے۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ تاریخ کے کسی دور میں یہ ترجیحات بدل گئی ہوں یا کسی صدی میں مسلمانوں نے ان سے اجتماعی روگردانی کر لی ہو یا کسی خاص مدت کے بعد ان میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہوں۔ یہ نشانیاں ہیں ایک اُمت کی جو تاریخ کے ہر دور میں اُمت رہی ہے، آج بھی اُمت ہے اور تاقیامت اُمت ہی رہے گی۔ کم وبیش تین سو سال کا عرصہ اُمت پر غلامی مسلط رہی، لیکن اس دوران بھی اُمت اپنی حیثیت کو فراموش نہ کر پائی اور ایک نظریاتی وعلامتی وجود باقی رہا۔ اس کی شاندار مثال ہندوستان کے مسلمانوں کی تحریکِ خلافت ہے۔ یہ اس تحریک کی تفصیلات کا موقع نہیں ہے، تاہم ترکی جو بالکل ایک الگ براعظم میں واقع ہے، اس کے مسلمانوں کے دکھ کو ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی تکلیف سمجھا اور ۱۹۱۷ء میں جب سلطان ایک مختصر مدت کے لیے تخت نشین ہوا تو ہندوستان کے طول وعرض اور دور دراز جزیروں سے پہاڑی دروں، وادیوں اور چوٹیوں تک ہر جگہ پر آنے والے پہلے جمعے کے خطبے میں علماء نے سلطان کا نام پڑھا، جس سے تاجِ برطانیہ اندر تک کانپ گیا۔ سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی کتاب ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' میں دورِ غلامی کے دوران مسلمان زعماء کے باہمی رابطوں پر اجمالی روشنی ڈالی ہے۔

تبلیغی جماعت کے بزرگ کاندھوں پر بستر اُٹھائے بعض اوقات ہفتوں کے سفر کے بعد منزلِ مقصود پر پہنچتے ہیں اور ایسی ایسی جگہوں پر پہنچتے ہیں جہاں اُن کی زبان نہیں سمجھی جاتی، وہاں کا پانی انہیں راس

نہیں آتا، وہاں کے کھانے انہیں ہضم نہیں ہوتے اور وہاں کے لوگ انہیں ایسے دیکھتے ہیں جیسے تماشا بھی نہیں دیکھا جاتا، لیکن ان سب کے باوجود اُن غیر مسلم بستیوں کے مسلمان انہیں ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں، ان کی اتنی قدر کرتے ہیں کہ قیام کا دورانیہ پورا ہوجاتا ہے، لیکن وہ گھر ابھی باقی ہوتے ہیں جہاں سے ان مبلغین کے لیے کھانا آنا ہوتا ہے، اور جب رخصت کا وقت آتا ہے تو سگے بھی اس طرح جدا نہیں ہوتے جس فرطِ محبت سے یہ مسلمان مبلغین کو جدا کرتے ہیں، ان سے گلے مل کر روتے ہیں اور پھر کہانی یہیں ختم نہیں ہوجاتی، بلکہ ان اَنجان مسلمان بھائیوں کے لیے دامن اُٹھا اُٹھا کر دعائیں کرنا ’’اُمت‘‘ کا وہ سرمایہ ہے، جسے اس زمین کے سینے پر دنیا کا کوئی پیمانہ ناپ نہیں سکتا اور زمانے کا کوئی ترازو اس کا وزن نہیں کرسکتا۔

ہم واشگاف الفاظ میں اس بات کا اظہار کرتے ہیں، ریاست کو اُمت سے برتر قرار دینا اور اُمت کے مفادات کو قربان کرکے ریاست کے مفادات کا تحفظ کرنا نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی تاریخ سے بغاوت ہوگی، بلکہ شریعتِ اسلامیہ کے قوانینِ سیاسی کی صریح خلاف ورزی گردانی جائے گی۔ اسلام نے مسلمانوں کو ایسی کسی ریاست کا تصور نہیں دیا جو رنگ، نسل، علاقہ، زبان یا کسی خاص تہذیب کی بنیاد پر اپنا وجود رکھتی ہو۔ ان سب تعصّبات کے قدآور بتوں کو توڑ کر ہی ایک مسلمان اُمت کا فرد بنتا ہے، پھر کسی ایسی ریاست کے مفاد کو اُمت کے مفاد سے عزیز تر رکھنا چہ معنی دارد؟ قائداعظم محمد علی جناح ؒ نے یہ الفاظ اس وقت کہے تھے جب وہ خیبر پختونخواہ کے دورے کے موقع پر پاک افغان سرحد پر موجود افغان سپاہی سے ہاتھ ملا رہے تھے کہ یہ سرحدیں شیطانی ہیں اور ہم دراصل دینِ اسلام کے ناطے سے سب بھائی بھائی ہیں۔ ستاون اسلامی ممالک کے حکمران آپس میں جو بھی جذبات رکھتے ہوں، لیکن پوری دنیا کے مسلمانوں کے دل ایک ساتھ دھڑکتے ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں جب ہم اپنے ایک صحافی ساتھی کے ہمراہ مرحوم نسیم حجازیؒ سے ملنے گئے تو ان کا کمرہ ہسپتال کے کمرے کے مشابہ ہوچکا تھا اور پیرانہ سالی کے باعث ان کی گفتگو بعض اوقات ناقابلِ فہم ہوجاتی تھی، باتوں میں جب مسلمانانِ بوسنیا کا ذکر آیا تو وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، ان کی سسکیاں آج بھی ہمارے کانوں میں گونجتی ہیں۔ اگر یہ تکلیف اُمت کا درد نہیں ہے، دنیا کا کونسا طبیب اس کی مرض شناسی کرے گا؟! کشمیر اور شیشان کے لیے دعا کرتے ہوئے اگر امامِ کعبہ کی ہچکی بندھ جاتی ہے اور کئی لمحوں تک وہ بولنے سے قاصر رہتے ہیں اور ان کے عقب میں کھڑے مسلمانوں کی آہیں اور سسکیاں لاؤڈ اسپیکر سے پھوٹ نکلتی ہیں تو کیا یہ جذبہ اُمت کے وجود کے لیے ناقابلِ تردید شہادت فراہم نہیں کرتا؟

اُمت کے کل مسلمان کتنے ہی کمزور ایمان کے مالک ہوں، کیسے ہی بے عمل ہوں، خورد ونوش اور بود وباش میں حرام وحلال کی پابندی کریں یا نہ کریں، فرائض وواجبات کے پابند ہوں یا ان سے غافل

ہوں، ان کے سینے اگر نورِ ایمان سے منور ہیں تو وہ بذاتِ خود اُمت کا حصہ ہیں اور ۹/۱۱ کے بعد تو اُمت کا تصور بعض علاقوں میں تعصب بن کر اُبھرا ہے۔ گویا طوفانِ مغرب نے مسلمان کو مسلمان کر دیا ہے۔ دنیا کے دور دراز کونوں کھدروں میں بسنے والے مسلمان جو اپنی حقیقت سے غافل تھے اور اُمت کے وجود سے کٹ سے گئے تھے، آج پھر اپنی اصل کی طرف گامزن ہیں۔ جہادِ افغانستان کے بعد عام طور پر اور گزشتہ چند سالوں سے خاص طور پر ایسے ایسے علاقوں سے حجاج کرام سفر کر کے اس مقدس فریضہ کے لیے آتے ہیں جہاں کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہاں بھی مسلمان کبھی موجود تھے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں دو قومی نظریہ پیش کیا گیا کہ تہذیب وتمدن اور زبان و بیان کی ہم آہنگی کے باوجود مذہب کا فرق اُمت کو دیگر اقوام سے ممتاز کرتا ہے۔ بالشویک انقلاب کے وقت یہ نظریہ غلط ثابت ہو گیا، کیونکہ مذہب کے فرق کے باوجود کئی اقوام نے مل کر کمیونسٹ نظریۂ حیات کے مطابق زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ قیامِ پاکستان کے وقت یہ نظریہ پھر صحیح ثابت ہوا کہ ایک قوم ہونے کے باوجود مذہب کے فرق نے ایک ریاست کے درمیان خونی لکیر کھینچ دی۔ سقوطِ ڈھاکہ سے اس نظریہ کی تردید مکرر ہوگئی کہ ایک مذہب ہونے کے باوجود قومیت کے فرق نے ایک ملک کو دولخت کر دیا، لیکن اس دو قومی نظریہ کا قطعی ثبوت گزشتہ صدی کے آخر میں اس وقت میسر آیا جب ماسکو کے سب سے بڑے لینن گراڈ چوک پر لینن کے مجسمے کو کرین کے ذریعے اُٹھا کر انتہائی بلندی سے زمین پر پھینک کر چکنا چور کر دیا گیا۔ وسطی ایشیائی ریاستیں ستر سالہ ظلم واستبداد سے آزاد ہوئیں اور کسی دیگر کیمپ کی بجائے انہوں نے بالاجماع اُمت کی ٹھنڈی چھاؤں میں آکر خاکِ کاشغر کو ایک بار پھر راہِ حجاز کا مسافر بنا دیا۔

سوال یہ ہے کہ تقلیدِ مغرب کے نتیجے میں کیا ہم اپنی حقیقت فراموش کر دیں گے؟ کیا اپنی ذات میں اس قدر محو ہو کر خود غرض بن چکیں گے کہ آنے والی نسلوں کو بھلا بیٹھیں؟ اور کیا تاریخ سے کبھی سبق نہ سیکھ پائیں گے؟ کم وبیش ایک صدی گزرنے کے بعد بھی ترکی جب یورپی یونین کا رکن بننے کی درخواست کرتا تھا تو جواب ملتا تھا کہ نہیں ابھی ایمان کی کچھ رمق تم میں باقی ہے۔ فلسطینیوں کے ایک گروہ نے اپنے آپ کو مکمل طور پر مغربیت میں ڈھال لیا تو کیا ان پر اہلِ مغرب بہت مہربان ہوگئے اور ان کے مسائل ختم ہوگئے؟ ماضی نہیں تو حال سے ہی سبق لے لیا جائے کہ یورپی اقوام کو صرف پاکستان کا اسلامی بم نظر آتا ہے۔ یہودی، ہندو، عیسائی اور سیکولر بم تو کہیں بھی انہیں دکھائی نہیں دیتے اور مشرقی تیمور کے دو عیسائیوں کا قتل انہیں چبھتا ہے، کشمیر سمیت دنیا بھر کے کتنے ہی مسلمان علاقوں میں مسلمانوں کا خون بہہ رہا ہے، وہ اُنہیں نظر نہیں آتا۔ اُمتِ مسلمہ کے حکمران کسی انتخاب کے ذریعے حکومت میں نہیں آئے، اس لیے اُمت ان کے اعمال سے بری ہے، لیکن یورپ اور امریکہ کے حکمرانوں کی پالیسیوں میں ان کے عوام براہِ

راست ذمہ دار ہیں کہ وہاں جمہوریت ان کی مرضی کی شکل میں موجود ہے۔

بچپن سے یہ سبق پڑھتے چلے آرہے ہیں کہ ’’اتحاد میں برکت ہے۔‘‘ فرد کو خاندان کی خاطر اپنا مفاد قربان کرنا پڑتا ہے، خاندان کو قبیلے کی خاطر اپنا مفاد قربان کرنا پڑتا ہے، قبیلے کو جرگہ کی خاطر اپنا مفاد قربان کرنا پڑتا ہے، جرگے کو ریاست کی خاطر اپنا مفاد قربان کرنا پڑتا ہے اور ریاست اگر اُمت کی خاطر اپنا مفاد قربان کرے گی اسی میں اُمت، ریاست، جرگہ، قبیلہ، خاندان اور فرد کا بھلا ہوگا، بصورتِ دیگر آج عراق کے شیعہ اور سنی فرقوں کے راہنماؤں نے پریس کے سامنے اس بات کو بیان کیا ہے کہ دشمن نے اُنہیں باہمی لڑائی کے لیے الگ الگ اور بھاری بھرکم رقومات فراہم کیں، دشمن ہمیں اُچک لے گا، جدا جدا کر کے ہمیں شکار کرے گا، ہمارے درمیان آگ لگائے گا اور ہمیں جلتا دیکھ کر خوشیوں کے گل چھڑے اُڑائے گا۔

اُمت کے دانشور دراصل اُمت کے امین ہیں، انہیں صبحِ روشن کی نوید اُمت کو دینی ہے۔ اہلِ فکر و دانش سرمایۂ بے بہا ہوتے ہیں، ان کی بات کو سنا جاتا ہے، ان کے اقوال کو محفلوں میں دہرایا جاتا ہے، وہ ایک معتبر حوالہ ہوتے ہیں، یہ لوگ وہ روشن دان ہیں جہاں سے شب تاریک کے اندھیرے چھٹنے کی خبر داخل ہوتی ہے، بادِ صبا انہیں لوگوں کے نفیس خیالات کا استعارہ ہے اور شبنم کے موتی انہیں کی شب خیزیوں سے عبارت ہیں، عوام ان کے ہاتھوں میں یوں ہوتے ہیں جیسے مردہ بدستِ زندہ۔ ہم اُمید کرتے ہیں یہ طبقہ اُمت کو صحیح راستہ دکھائے گا، غلامی کی باقی ماندہ زنجیریں بھی توڑنے کا باعث بنے گا، اپنے جزو کو اُمت کے کل کی طرف لے کر بڑھے گا۔ قرآن وسنت اور اسلاف کے طریقہ کو تھامے صراطِ مستقیم پر اُمت کی قیادت کرتا ہوا نظر آئے گا اور ہم دیکھتے ہیں کہ مشرق سے ایک بار پھر اُمت کے عروج کا سورج طلوع ہوا چاہتا ہے اور انسانیت کی آسودگی کے دن قریب سے قریب تر ہوتے چلے جارہے ہیں، جب نفسانیت، خودغرضی، خوں ریزی اور جنسیت کی بجائے پیار، محبت، امن و آشتی، خودآگاہی وخداآگاہی کا دور دورہ ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ علامہ اقبالؒ فرما گئے ہیں:

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اُخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی
میانِ شاخساراں صحبتِ مرغِ چمن کب تک
ترے بازو میں ہے پروازِ شاہینِ قہستانی

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....